QuranUrdu.com

تفہیم القرآن

المنافقون

(٦٣)

QuranUrdu.com

المنافقون

نام پہلی آیت کے فقرے اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ سے ماخوذ ہے۔ یہ اس سُورت کا نام بھی ہے اور اس کے مضمون کا عنوان بھی، کیونکہ اس میں منافقین ہی کے طرزِ عمل پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

زمانۂ نُزُول جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے، یہ سورت غزوۂ بنی المُصْطَلِق سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی پر یا تو دورانِ سفر میں نازل ہوئی ہے، یا حضورؐ کے مدینۂ طیّبہ پہنچنے کے بعد فوراً ہی اس کا نُزول ہوا ہے۔ اور ہم سورۂ نُور کے دیباچے میں یہ بات تحقیق بیان کر چکے ہیں کہ غزوۂ بنی المُصْطَلِق شعبان ۶ھ میں واقع ہوا تھا۔ اس طرح اِس کی تاریخِ نُزُول ٹھیک ٹھیک متعیّن ہو جاتی ہے۔

تاریخی پَس منظر جس خاص واقعے کے بارے میں یہ سُورت نازل ہوئی ہے، اس کا ذکر کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مدینے کے منافقین کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈال لی جائے، کیونکہ جو واقعہ اُس موقع پر پیش آیا تھا، وہ محض ایک اتفاقی حادثہ نہ تھا، بلکہ اُس کے پیچھے ایک پُورا سلسلۂ واقعات تھا جو بالآخر اِس نوبت تک پہنچا۔

مدینۂ طیّبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے اَوس اور خَزْرج کے قبیلے آپس کی خانہ جنگیوں سے تھک کر ایک شخص کی قیادت و سیادت پر قریب قریب متفق ہو چکے تھے اور اس بات کی تیاریاں کر رہے تھے کہ اس کو اپنا بادشاہ بنا کر باقاعدہ اس کی تاجپوشی کی رسم ادا کر دیں، حتّٰی کہ اس کے لیے تاج بنا بھی لیا گیا تھا۔ یہ قبیلۂ خَزْرج کا رئیس عبد اللہ بن اُبَیّ بن سَلُول تھا۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ قبیلۂ خَزْرَج میں اس کی بزرگی بالکل مُتَّفَقْ عَلَیْہ تھی، اور اَوس و خَزْرَج اِس سے پہلے کبھی ایک شخص کی قیادت پر جمع نہیں ہوئے تھے۔ (ابنِ ہِشَام، ج ۲، ص ۲۳۴)

اس صورتِ حال میں اسلام کا چرچا مدینے پہنچا اور ان دونوں قبیلوں کے با اثر آدمی مسلمان ہونے شروع ہو گئے۔ ہجرت سے پہلے بیعت عَقَبۂ ثانیہ کے موقع پر جب رسولؐ اللہ کو مدینۂ طیّبہ تشریف لانے کی دعوت دی جا رہی تھی، اُس وقت حضرت عباسؓ بن عُبَادَہ بن نَضلہ انصاری اِس دعوت کو صرف اِس مصلحت سے مؤخر کرنا چاہتے تھے کہ عبداللہ بن اُبَیّ بھی بیعت اور دعوت میں شریک ہو جائے، تاکہ مدینہ بالاتفاق اسلام کا مرکز بن سکے۔ لیکن جو وفد بیعت کے لیے حاضر ہوا تھا، اس نے اِس مَصلَحت کو کوئی اہمیت نہ دی اور اس کے تمام شرکا، جن میں دونوں قبیلوں کے ۷۵ آدمی شامل

QuranUrdu.com

تھے، ہر خطرہ مول لے کر حضورؐ کو دعوت دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ (ابنِ ہِشام، ج ۲، ص ۸۹) اِس واقعے کی تفصیلات ہم سورۂ اَنفال کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں۔

اس کے بعد جب حضورؐ مدینے پہنچے تو انصار کے ہر گھرانے میں اسلام اتنا پھیل چکا تھا کہ عبداللہ بن اُبَیّ بے بس ہو گیا اور اس کو اپنی سرداری بچانے کی اس کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی کہ خود بھی مسلمان ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنے اُن بہت سے حامیوں کے ساتھ، جن میں دونوں قبیلوں کے شُیوخ اور سردار شامل تھے، داخلِ اسلام ہو گیا، حالانکہ دل اِن سب کے جل رہے تھے، اور خاص طور پر ابنِ اُبَیّ کو اس بات کا سخت غم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی بادشاہی چھین لی ہے۔ کئی سال تک اس کا یہ منافقانہ ایمان اور اپنی ریاست چِھن جانے کا یہ غم طرح طرح کے رنگ دکھاتا رہا۔ ایک طرف حال یہ تھا کہ ہر جمعے کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے بیٹھتے تو عبداللہ بن اُبَیّ اُٹھ کر کہتا کہ ”حضرات! یہ اللہ کے رسول آپ کے درمیان موجود ہیں، جن کی ذات سے اللہ نے آپ کو عزت اور شرف بخشا ہے، لہٰذا آپ اِن کی تائید کریں اور جو کچھ یہ فرماتے ہیں اسے غور سے سُنیں اور اِن کی اطاعت کریں۔“ (ابنِ ہِشام، ج ۳، ص ۱۱۱) دوسری طرف کیفیّت یہ تھی کہ روز بروز اس کی منافقت کا پردہ چاک ہوتا چلا جا رہا تھا اور مخلص مسلمانوں پر یہ بات کُھلتی چلی جاتی تھی کہ وہ اور اس کے ساتھی اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور گروہ اہلِ ایمان سے سخت بغض رکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی راستے سے گزر رہے تھے کہ ابنِ اُبَیّ نے آپؐ کے ساتھ بدتمیزی کی۔ آپؐ نے حضرت سعدؓ بن عُبادہ سے اس کی شکایت فرمائی تو اُنھوں نے عرض کیا: ”یا رسولؐ اللہ! اس شخص کے ساتھ نرمی برتیے۔ آپؐ کی تشریف آوری سے پہلے ہم اس کے لیے تاجِ شاہی تیار کر رہے تھے، اب یہ سمجھتا ہے کہ آپؐ نے اس سے بادشاہی چھین لی ہے۔“ (ابنِ ہِشام، ج ۲، ص ۲۳۷-۲۳۸)

جنگِ بدر کے بعد جب یہودِ بنی قَینُقاع کی صریح بدعہدی اور بلا اشتعال سرکشی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن پر چڑھائی کی تو یہ شخص اُن کی حمایت پر اُٹھ کھڑا ہوا اور حضورؐ کی زِرہ پکڑ کر کہنے لگا کہ ”یہ سات سو مردانِ جنگی، جو ہر دشمن کے مقابلے میں میرا ساتھ دیتے رہے ہیں، آج ایک دن میں آپؐ اُنھیں ختم کر ڈالنا چاہتے ہیں؟ خدا کی قسم! میں آپؐ کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا جب تک آپؐ میرے اِن حلیفوں کو معاف نہ کر دیں گے۔“ (ابنِ ہِشام، ج ۳، ص ۵۱-۵۲)

جنگِ اُحُد کے موقع پر اس شخص نے صریح غدّاری کی اور عین وقت پر اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر میدانِ جنگ سے اُلٹا واپس آ گیا۔ جس نازک گھڑی میں اس نے یہ حرکت کی تھی، اس کی نزاکت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ قریش کے لوگ تین ہزار کا لشکر لے کر مدینے پر چڑھ آئے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مقابلے میں صرف ایک ہزار آدمی ساتھ لے کر مدافعت کے لیے نکلے تھے۔

QuranUrdu.com

اِن ایک ہزار میں سے بھی یہ منافق تین سو آدمی توڑ لایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف سات سو کی جمعیّت کے ساتھ تین ہزار دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔

اِس واقعے کے بعد مدینے کے عام مسلمانوں کو یقین کے ساتھ یہ معلوم ہو گیا کہ یہ شخص قطعی منافق ہے، اور اس کے وہ ساتھی بھی پہچان لیے گئے جو منافقت میں اس کے شریکِ کار تھے۔ اِسی بنا پر جنگِ اُحُد کے بعد جب پہلا جمعہ آیا اور یہ شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے سے پہلے حسبِ معمول تقریر کرنے کے لیے اُٹھا تو لوگوں نے اس کا دامن کھینچ کر کہا: ''بیٹھ جاؤ، تم یہ باتیں کرنے کے اہل نہیں ہو۔'' مدینے میں یہ پہلا موقع تھا کہ عَلانِیَہ اِس شخص کی تذلیل کی گئی۔ اس پر برہم ہو کر وہ لوگوں کی گردنوں پر سے کُودتا پھاندتا مسجد سے نکل گیا۔ مسجد کے دروازے پر بعض انصاریوں نے اس سے کہا: ''یہ کیا حرکت کر رہے ہو، واپس چلو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اِستِغفار کی درخواست کرو۔'' اس نے بگڑ کر جواب دیا: ''مَیں ان سے کوئی اِستِغفار نہیں کرانا چاہتا۔'' (ابنِ ہِشَام، ج ۳، ص ۱۱۱)

پھر ۴ھ میں غزوۂ بنی النَّضِیر پیش آیا اور اس موقع پر اس شخص نے اور اس کے ساتھیوں نے اور بھی زیادہ کھل کر اسلام کے خلاف اعدائے اسلام کی حمایت کی۔ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جاں نثار صحابہؓ اِن یہودی دشمنوں سے جنگ کی تیاری کر رہے تھے، اور دوسری طرف یہ منافقین اندر ہی اندر یہودیوں کو پیغام بھیج رہے تھے کہ ڈٹے رہو، ہم تمھارے ساتھ ہیں، تم سے جنگ کی جائے گی تو ہم تمھاری مدد کریں گے، اور تم کو نکالا جائے گا تو ہم تمھارے ساتھ نکلیں گے۔ اس خفیہ ساز باز کا راز اللہ تعالیٰ نے خود کھول دیا، جیسا کہ سورۂ حشر کے دوسرے رُکوع میں گزر چکا ہے۔

لیکن اُس کی اور اُس کے ساتھیوں کی اِتنی پردہ دری ہو جانے کے باوجود جس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے ساتھ درگزر کا معاملہ فرما رہے تھے، وہ یہ تھی کہ منافقین کا ایک بڑا جتّھا اس کے ساتھ تھا۔ اَوس اور خَزْرَج دونوں قبیلوں کے بہت سے سردار اس کے حامی تھے۔ مدینے کی آبادی میں کم از کم ایک تہائی تعداد اُس کے ساتھیوں کی موجود تھی، جیسا کہ غزوۂ اُحُد کے موقع پر ظاہر ہو چکا تھا۔ ایسی حالت میں یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ باہر کے دشمنوں سے لڑائی کے ساتھ ساتھ اندر کے اِن دشمنوں سے بھی جنگ مُول لے لی جاتی۔ اسی بنا پر اُن کی منافقت کا حال جانتے ہوئے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مدّت تک ان کے ساتھ ان کے ظاہری دعوائے ایمان کے لحاظ سے معاملہ فرماتے رہے۔ دوسری طرف یہ لوگ بھی نہ اتنی طاقت رکھتے تھے نہ ہمّت کہ عَلانِیَہ کافر بن کر اہلِ ایمان سے لڑ لیتے، یا کسی حملہ آور دشمن کے ساتھ کھلّم کھلّا مل کر میدان میں آ جاتے۔ بظاہر وہ اپنا ایک مضبوط جتھا بنائے ہوئے تھے، مگر ان کے اندر وہ کمزوریاں موجود تھیں جن کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ حشر کی آیات ۱۲-۱۴ میں صاف صاف کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اس لیے وہ مسلمان بنے رہنے میں ہی اپنی خیر سمجھتے تھے۔ مسجدوں میں آتے تھے۔

QuranUrdu.com

نمازیں پڑھتے تھے۔ زکوٰۃ بھی دے ڈالتے تھے۔ زبان سے ایمان کے وہ لمبے چوڑے دعوے کرتے تھے جن کے کرنے کی مخلص مسلمانوں کو کبھی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ ان کے پاس اپنی ہر منافقانہ حرکت کے لیے ہزار جھوٹی توجیہیں موجود تھیں، جن سے وہ خاص طور پر اپنے ہم قبیلہ انصار کو یہ دھوکا دینے کی کوشش کرتے رہتے تھے کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ ان تدبیروں سے وہ اپنے آپ کو اُن نقصانات سے بھی بچا رہے تھے جو انصار کی بَرادری سے الگ ہو جانے کی صورت میں ان کو پہنچ سکتے تھے، اور فتنہ پردازی کے اُن مواقع سے بھی فائدہ اُٹھا رہے تھے جو اس برادری میں شامل رہ کر انھیں مل سکتے تھے۔

یہی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے عبداللہ بن اُبَیّ اور اس کے ساتھی منافقین کو غَزوۂ بنی المُصْطَلِق کی مہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانے کا موقع مل گیا، اور انھوں نے بیک وقت دو ایسے عظیم فتنے اُٹھا دیے جو مسلمانوں کی جمعیّت کو بالکل پارہ پارہ کر سکتے تھے۔ مگر قرآنِ پاک کی تعلیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے اہلِ ایمان کو جو بہترین تربیت ملی تھی، اُس کی بدولت اِن دونوں فتنوں کا بروقت قَلْع قَمْع ہو گیا اور یہ منافقین اُلٹے خود ہی رُسوا ہو کر رہ گئے۔ ان میں سے ایک فتنہ وہ تھا جس کا ذکر سورۂ نور میں گزر چکا ہے۔ اور دوسرا فتنہ یہ ہے جس کا اِس سورت میں ذکر کیا گیا ہے۔

اس واقعے کو بخاری، مسلم، احمد، نَسائی، تِرمِذی، بَیہَقی، طَبَرانی، ابنِ مَرْدُوْیَہ، عبدالرزّاق، ابنِ جَرِیر طَبَری، ابنِ سعد اور محمد بن اسحاق نے بکثرت سندوں سے نقل کیا ہے۔ بعض روایات میں اُس مہم کا نام نہیں لیا گیا ہے جس میں یہ پیش آیا تھا، اور بعض میں اسے غزوۂ تَبوک کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ مگر مَغازی اور سِیَر کے علما اس بات پر متفق ہیں کہ یہ واقعہ غَزوۂ بنی المُصْطَلِق کے موقع پر پیش آیا تھا۔ صورتِ واقعہ تمام روایات کو جمع کرنے سے یہ معلوم ہوتی ہے:

بنی المُصْطَلِق کو شکست دینے کے بعد ابھی لشکرِ اسلام اُس بستی میں ٹھیرا ہوا تھا جو مُرَیسِیع نامی کنویں پر آباد تھی کہ یکایک پانی پر دو صاحبوں کا جھگڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک کا نام جَہْجَاہ بن مسعود غِفَاری تھا جو حضرت عمرؓ کے ملازم تھے اور اُن کا گھوڑا سنبھالنے کی خدمت انجام دیتے تھے، اور دوسرے صاحب سِنان بن وَبَر الجُہَنی[1] تھے جن کا قبیلہ خَزْرَج کے ایک قبیلے کا حلیف تھا۔ زبانی ترش کلامی سے گزر کر نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی اور جَہْجَاہ نے سِنان کے ایک لات رسید کر دی، جسے اپنی قدیم یمنی روایات کی بنا پر انصار سخت توہین و تذلیل سمجھتے تھے۔ اس پر سِنان نے انصار کو مدد کے لیے پکارا، اور جَہْجَاہ نے مہاجرین کو آواز دی۔ ابنِ اُبَیّ نے اِس جھگڑے کی خبر سُنتے ہی اَوس اور خَزْرَج کے لوگوں کو بھڑکانا اور چیخنا شروع کر دیا کہ دوڑو اور اپنے حلیف کی مدد کرو۔ اُدھر سے کچھ مہاجرین بھی نکل آئے۔ قریب تھا کہ

---

[1] دونوں اصحاب کے نام مختلف رِوایات میں مختلف بیان کیے گئے ہیں۔ ہم نے یہ نام ابنِ ہِشام کی روایت سے لیے ہیں۔

QuranUrdu.com

بات بڑھ جاتی اور اُسی جگہ انصار و مہاجرین آپس میں لڑ پڑتے جہاں ابھی ابھی وہ مل کر ایک دشمن قبیلے سے لڑے تھے اور اُسے شکست دے کر ابھی اُسی کے علاقے میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ لیکن یہ شور سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکل آئے اور آپؐ نے فرمایا: **ما بالُ دعوی الجاهلية؟ ما لكم ولدعوة الجاهلية؟ دعوها فانها مُنْتِنَة۔** ''یہ جاہلیّت کی پکار کیسی؟ تم لوگ کہاں اور یہ جاہلیّت کی پکار کہاں؟ اِسے چھوڑ دو، یہ بڑی گندی چیز ہے[1]۔'' اس پر دونوں طرف کے صالح لوگوں نے آگے بڑھ کر معاملہ رفع دفع کرا دیا اور سِنان نے جَہجَاہ کو معاف کر کے صلح کر لی۔

اس کے بعد ہر وہ شخص جس کے دل میں نِفاق تھا، عبداللہ بن اُبَیّ کے پاس پہنچا اور اِن لوگوں نے جمع ہو کر اس سے کہا کہ ''اب تک تو تم سے اُمّیدیں وابستہ تھیں اور تم مدافَعَت کر رہے تھے، مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ تم ہمارے مقابلے میں اِن کنگلوں[2] کے مددگار بن گئے ہو۔'' ابنِ اُبَیّ پہلے ہی کھول رہا تھا۔ اِن باتوں سے وہ اور بھی زیادہ بھڑک اُٹھا۔ کہنے لگا: ''یہ سب کچھ تمھارا اپنا ہی کیا دھرا ہے۔ تم نے اِن لوگوں کو اپنے ملک میں جگہ دی، ان پر اپنے مال تقسیم کیے، یہاں تک کہ اب یہ پھل پھول کر خود ہمارے ہی حریف بن گئے۔

---

[1] یہ ایک بڑی اہم بات ہے جو اِس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی۔ اسلام کی صحیح روح کو سمجھنے کے لیے اِسے ٹھیک ٹھیک سمجھ لینا ضروری ہے۔ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ دو آدمی اگر اپنے جھگڑے میں لوگوں کو مدد کے لیے پکارنا چاہیں تو وہ کہیں: ''مسلمانو! آؤ اور ہماری مدد کرو'' یا یہ کہ ''لوگو! ہماری مدد کے لیے آؤ''۔ لیکن اگر ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے قبیلے، یا برادری، یا نسل و رنگ، یا علاقے کے نام پر لوگوں کو پکارتا ہے تو یہ جاہلیّت کی پکار ہے، اور اس پکار پر لبیک کہہ کر آنے والے اگر یہ نہیں دیکھتے کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون، اور حق و انصاف کی بنا پر مظلوم کی حمایت کرنے کے بجائے اپنے اپنے گروہ کے آدمی کی حمایت میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو جاتے ہیں تو یہ جاہلیّت کا فعل ہے جس سے دنیا میں فساد برپا ہوتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے گندی اور گھناؤنی چیز قرار دیا اور مسلمانوں سے فرمایا کہ تمھارا اِس جاہلیّت کی پکار سے کیا واسطہ؟ تم اسلام کی بنیاد پر ایک ملّت بنے تھے، اب یہ انصار اور مہاجر کے نام پر تمھیں کیسے پکارا جا رہا ہے، اور اس پکار پر تم کہاں دوڑے جا رہے ہو؟ علّامہ سُہَیلیؒ نے رَوضُ الاُنُف میں لکھا ہے کہ فقہائے اسلام نے کسی جھگڑے یا اختلاف میں جاہلیّت کی پکار بلند کرنے کو ایک فوجداری جُرم قرار دیا ہے۔ ایک گروہ اس کی سزا پچاس ضرب تازیانہ قرار دیتا ہے، دوسرا گروہ دس ضرب تجویز کرتا ہے، اور تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اس کی سزا حالات کی مناسبت سے دی جانی چاہیے۔ بعض حالات میں صرف زَجر و توبیخ کافی ہے، بعض دوسرے حالات میں ایسی پکار بلند کرنے والے کو قید کرنا چاہیے، اور اگر یہ زیادہ شر انگیز ہو تو اس کے مرتکب کو سزائے تازیانہ دینی چاہیے۔

[2] مدینے کے منافقین اُن تمام لوگوں کو جو اسلام قبول کر کر کے مدینے میں آ رہے تھے، ''جلابِیب'' کہا کرتے تھے۔ لُغوی معنٰی تو اس لفظ کے گلیم پوش یا موٹے جھوٹے کپڑے پہننے والے کے ہیں، مگر اصل مفہُوم جس میں وہ لوگ غریب مہاجرین کی تذلیل کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے تھے، کنگلے کے لفظ سے زیادہ صحیح طور پر ادا ہوتا ہے۔

QuranUrdu.com

ہماری اور اِن قریش کے کنگلوں (یا اصحابِ محمدؐ) کی حالت پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ اپنے کُتّے کو کھلا پلا کر موٹا کر، تاکہ تجھی کو پھاڑ کھائے۔ تم لوگ ان سے ہاتھ روک لو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں۔ خدا کی قسم! مدینے واپس پہنچ کر ہم میں سے جو عزّت والا ہے، وہ ذلیل کو نکال دے گا۔''

مجلس میں اتفاق سے حضرت زیدؓ بن اَرقَم بھی موجود تھے جو اُس وقت ایک کم عمر لڑکے تھے۔ انھوں نے یہ باتیں سُن کر اپنے چچا سے ان کا ذکر کیا، اور اُن کے چچا نے جو انصار کے رئیسوں میں سے تھے، جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سارا واقعہ بیان کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ کو بلا کر دریافت کیا تو انھوں نے جو کچھ سنا تھا، مِن وعَن دُہرا دیا۔[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شاید تم ابنِ اُبَیّ سے ناراض ہو۔ ممکن ہے تم سے سُننے میں کچھ غَلَطی ہوگئی ہو۔ ممکن ہے تمھیں شبہ ہوگیا ہو کہ ابنِ اُبَیّ یہ کہہ رہا ہے۔'' مگر زیدؓ نے عرض کیا: ''نہیں حضورؐ، خدا کی قسم! مَیں نے اس کو یہ باتیں کہتے سُنا ہے۔'' اس پر حضورؐ نے ابنِ اُبَیّ کو بلا کر پوچھا تو وہ صاف مُکر گیا اور قسمیں کھانے لگا کہ میں نے یہ باتیں ہرگز نہیں کہیں۔ انصار کے لوگوں نے بھی کہا کہ حضورؐ! لڑکے کی بات ہے۔ شاید اسے وہم ہوگیا ہو۔ یہ ہمارا شیخ اور بزرگ ہے۔ اِس کے مقابلے میں ایک لڑکے کی بات کا اعتبار نہ فرمایئے۔ قبیلے کے بڑے بوڑھوں نے زیدؓ کو بھی ملامت کی اور وہ بیچارے رنجیدہ ہو کر اپنی جگہ بیٹھ رہے۔ مگر حضورؐ زیدؓ کو بھی جانتے تھے اور عبداللہ بن اُبَیّ کو بھی، اس لیے آپؐ سمجھ گئے کہ اصل بات کیا ہے۔

حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے آ کر عرض کیا: ''مجھے اجازت دیجیے کہ اس منافق کی گردن اُڑا دوں۔ یا اگر مجھے یہ اجازت دینا مناسب خیال نہیں فرماتے تو خود انصار ہی میں سے مُعاذ بن جَبَلؓ، یا عَبّادؓ بن بِشر، یا سعدؓ بن مُعاذ، یا محمدؓ بن مَسْلَمَہ کو حکم دیجیے[2] کہ وہ اسے قتل کر دیں۔'' مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایسا نہ کرو، لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں ہی کو قتل کر رہا ہے۔'' اس کے بعد آپؐ نے فوراً ہی کوچ کا حکم دے دیا، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معمول کے لحاظ سے وہ کوچ کا وقت نہ تھا۔ مسلسل ۳۰ گھنٹے چلتے رہے، یہاں تک کہ لوگ تھک کر چُور ہوگئے۔ پھر آپؐ نے ایک جگہ پڑاؤ کیا اور تھکے ہوئے لوگ زمین پر کمر ٹکاتے ہی سو گئے۔ یہ آپؐ نے اس لیے کیا کہ جو کچھ مُرَیسِیع کے کنویں پر پیش آیا تھا، اس کے اثرات لوگوں کے ذہن سے محو

---

[1] فقہا نے اِس سے یہ حکم اخذ کیا ہے کہ ایک شخص کی بُری بات دوسرے شخص تک پہنچانا اگر کسی دینی، اَخلاقی یا ملّی مصلحت کے لیے ہو تو یہ چُغلی کی تعریف میں نہیں آتا۔ شریعت میں جس چُغل خوری کو حرام کیا گیا ہے، وہ فساد کی غرض سے اور لوگوں کو آپس میں لڑانے کے لیے چُغلی کھانا ہے۔

[2] مختلف روایات میں مختلف انصاری بزرگوں کے نام آئے ہیں جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے عرض کیا تھا کہ آپؐ ان میں سے کسی شخص سے یہ خدمت لے لیں اگر مجھ سے اس لیے یہ کام لینا مناسب خیال نہیں فرماتے کہ میں مہاجر ہوں، میرے ہاتھوں اس کے مارے جانے سے فتنے بھڑک اُٹھنے کا امکان ہے۔

QuranUrdu.com

ہو جائیں۔ راستے میں انصار کے ایک سردار حضرت اُسَیدؓ بن حُضَیر آپ سے ملے اور عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ! آج آپؐ نے ایسے وقت کوچ کا حکم دیا جو سفر کے لیے موزوں نہ تھا اور آپؐ کبھی ایسے وقت میں سفر کا آغاز نہیں فرمایا کرتے تھے؟'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ''تم نے سُنا نہیں کہ تمھارے اُن صاحب نے کیا گوہر افشانی کی ہے؟'' انھوں نے پوچھا: ''کون صاحب؟'' فرمایا: ''عبداللہ بن اُبَیّ''۔ انھوں نے پوچھا: ''اس نے کیا کہا؟'' فرمایا: ''اس نے کہا ہے کہ مدینے پہنچ کر عزت والا ذلیل کو نکال باہر کرے گا۔'' انھوں نے عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ، خدا کی قسم! عزت والے تو آپؐ ہیں اور ذلیل وہ ہے، آپؐ جب چاہیں اسے نکال سکتے ہیں۔''

رفتہ رفتہ یہ بات تمام انصار میں پھیل گئی اور ان میں ابنِ اُبَیّ کے خلاف سخت غصّہ پیدا ہو گیا۔ لوگوں نے ابنِ اُبَیّ سے کہا: ''جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی مانگو۔'' مگر اس نے تڑخ کر جواب دیا: ''تم نے کہا کہ اُن پر ایمان لاؤ۔ مَیں ایمان لے آیا۔ تم نے کہا کہ اپنے مال کی زکوٰۃ دو۔ میں نے زکوٰۃ بھی دے دی۔ اب بس یہ کسر رہ گئی ہے کہ میں محمدؐ کو سجدہ کروں۔'' ان باتوں سے اس کے خلاف مومنینِ انصار کی ناراضی اور زیادہ بڑھ گئی اور ہر طرف سے اُس پر پھٹکار پڑنے لگی۔ جب یہ قافلہ مدینۂ طیّبہ میں داخل ہونے لگا تو عبداللہ بن اُبَیّ کے صاحبزادے، جن کا نام بھی عبداللہؓ ہی تھا، تلوار سُونت کر باپ کے آگے کھڑے ہو گئے اور بولے: ''آپ نے کہا تھا کہ مدینے واپس پہنچ کر عزت والا ذلیل کو نکال دے گا، اب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ عزت آپ کی ہے یا اللہ اور اس کے رسولؐ کی۔ خدا کی قسم! آپ مدینے میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اجازت نہ دیں۔'' اس پر ابنِ اُبَیّ چیخ اُٹھا: ''خَزْرَج کے لوگو! ذرا دیکھو، میرا بیٹا ہی مجھے مدینے میں داخل ہونے سے روک رہا ہے۔'' لوگوں نے یہ خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائی اور آپؐ نے فرمایا: ''عبداللہ سے کہو، اپنے باپ کو گھر آنے دے۔'' عبداللہؓ نے کہا: ''اُن کا حکم ہے تو اب آپ داخل ہو سکتے ہیں۔'' اُس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: ''کیوں عمر! اب تمھارا کیا خیال ہے؟ جس وقت تم نے کہا تھا کہ مجھے اُس کو قتل کرنے کی اجازت دیجیے اُس وقت اگر تم اسے قتل کر دیتے تو بہت سی ناکیں اس پر پھڑکنے لگتیں۔ آج اگر میں اس کے قتل کا حکم دوں تو اسے قتل تک کیا جا سکتا ہے۔'' حضرت عمرؓ نے عرض کیا: ''خدا کی قسم! اب مجھے معلوم ہو گیا کہ اللہ کے رسول کی بات میری بات سے زیادہ مبنی بر حکمت تھی۔''

---

[1] اس سے دو اہم شرعی مسئلوں پر روشنی پڑتی ہے: ایک یہ کہ جو طرزِ عمل ابنِ اُبَیّ نے اختیار کیا تھا، اگر کوئی شخص مُسلم ملّت میں رہتے ہوئے اُس طرح کا رَوِیّہ اختیار کرے تو وہ قتل کا مستحق ہے۔ دوسرے یہ کہ محض قانوناً کسی شخص کے مستحقِ قتل ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ضرور اسے قتل ہی کر دیا جائے۔ ایسے کسی فیصلے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا اس کا قتل کسی عظیم تر فتنے کا مُوجِب تو نہ بن جائے گا۔ حالات سے آنکھیں بند کر کے قانون کا اندھا دُھند استعمال بعض اوقات اُس مقصد کے خلاف بالکل اُلٹا

QuranUrdu.com

یہ تھے وہ حالات جن میں یہ سُورت، اغلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئی۔

نتیجہ پیدا کر دیتا ہے جس کے لیے قانون استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر ایک منافق اور مفسد آدمی کے پیچھے کوئی قابلِ لحاظ سیاسی طاقت موجود ہو تو اسے سزا دے کر مزید فتنوں کو سر اُٹھانے کا موقع دینے سے بہتر یہ ہے کہ حکمت اور تدبُّر کے ساتھ اُس اصل سیاسی طاقت کا اِستیصال کر دیا جائے جس کے بل پر وہ شرارت کر رہا ہو۔ یہی مَصلَحت تھی جس کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن اُبَیّ کو اُس وقت بھی سزا نہ دی جب آپؐ اسے سزا دینے پر قادر تھے، بلکہ اُس کے ساتھ برابر نرمی کا سلوک کرتے رہے، یہاں تک کہ دو تین سال کے اندر مدینے میں منافقین کا زور ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔

QuranUrdu.com

۱۱ ایاتہا

سُوْرَةُ الْمُنٰفِقُوْنَ مَدَنِيَّةٌ

۲ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ
يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴿۱﴾ وقف لازم
اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ

اے نبیؐ! جب یہ منافق تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ یقیناً اللہ کے رسولؐ ہیں۔'' ہاں، اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اُس کے رسولؐ ہو، مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں[1]۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے[2] اور اِس طرح یہ اللہ کے راستے سے خود رُکتے اور دنیا کو روکتے ہیں[3]۔

۱- یعنی جو بات وہ زبان سے کہہ رہے ہیں، وہ ہے تو بجائے خود سچّی، لیکن چونکہ اُن کا اپنا عقیدہ وہ نہیں ہے جسے وہ زبان سے ظاہر کر رہے ہیں، اس لیے اپنے اِس قول میں وہ جھوٹے ہیں کہ وہ آپؐ کے رسولؐ ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ شہادت دو چیزوں سے مرکب ہوتی ہے: ایک وہ اصل بات جس کی شہادت دی جائے۔ دوسرے اُس بات کے متعلق شہادت دینے والے کا اپنا عقیدہ۔ اب اگر بات بجائے خود بھی سچّی ہو، اور شہادت دینے والے کا عقیدہ بھی وہی ہو جس کو وہ زبان سے بیان کر رہا ہو، تو ہر لحاظ سے وہ سچا ہوگا۔ اور اگر بات اپنی جگہ جھوٹی ہو، لیکن شہادت دینے والا اُسی کے حق ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو، تو ہم ایک لحاظ سے اُس کو سچّا کہیں گے، کیونکہ وہ اپنا عقیدہ بیان کرنے میں صادق ہے، اور ایک دوسرے لحاظ سے اس کو جھوٹا کہیں گے، کیونکہ جس بات کی وہ شہادت دے رہا ہے وہ بجائے خود غلط ہے۔ اس کے برعکس اگر بات اپنی جگہ سچّی ہو لیکن شہادت دینے والے کا اپنا عقیدہ اس کے خلاف ہو، تو ہم اِس لحاظ سے اس کو سچّا کہیں گے کہ وہ صحیح بات کی شہادت دے رہا ہے، اور اِس لحاظ سے اس کو جھوٹا کہیں گے کہ اس کا اپنا عقیدہ وہ نہیں ہے جس کا وہ زبان سے اظہار کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مومن اگر اسلام کو برحق کہے تو وہ ہر لحاظ سے سچّا ہے۔ لیکن ایک یہودی اپنی یہودیت پر قائم رہتے ہوئے اس دین کو اگر برحق کہے تو بات اس کی سچّی ہو گی مگر شہادت اُس کی جھوٹی قرار دی جائے گی، کیونکہ وہ اپنے عقیدے کے خلاف شہادت دے رہا ہے۔ اور اگر وہ اِس دین کو باطل کہے، تو ہم کہیں گے کہ بات اس کی جھوٹی ہے، مگر شہادت وہ اپنے عقیدے کے مطابق سچّی دے رہا ہے۔

QuranUrdu.com

سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝٢ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ
عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝٣ وَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ
اَجْسَامُهُمْ ؕ وَ اِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ

کیسی بُری حرکتیں ہیں جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ ان لوگوں نے ایمان لا کر پھر کفر کیا اس لیے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی گئی، اب یہ کچھ نہیں سمجھتے۔[۴]

اِنھیں دیکھو تو اِن کے جُثّے تمھیں بڑے شاندار نظر آئیں۔ بولیں تو تم ان کی باتیں سُنتے رہ جاؤ۔[۵] مگر اصل میں یہ گویا لکڑی کے کُندے ہیں جو دیوار کے ساتھ چُن کر رکھ دیے گئے ہوں۔[۶]

۲- یعنی اپنے مسلمان اور مومن ہونے کا یقین دلانے کے لیے جو قَسمیں وہ کھاتے ہیں، اُن سے وہ ڈھال کا کام لیتے ہیں، تاکہ مسلمانوں کے غصّے سے بچے رہیں اور ان کے ساتھ مسلمان وہ برتاؤ نہ کر سکیں جو کُھلے کُھلے دشمنوں سے کیا جاتا ہے۔

اِن قَسموں سے مراد وہ قَسمیں بھی ہو سکتی ہیں جو وہ بالعُموم اپنے ایمان کا یقین دلانے کے لیے کھایا کرتے تھے، اور وہ قَسمیں بھی ہو سکتی ہیں جو اپنی کسی منافقانہ حرکت کے پکڑے جانے پر وہ کھاتے تھے، تاکہ مسلمانوں کو یہ یقین دلائیں کہ وہ حرکت انھوں نے منافقت کی بنا پر نہیں کی تھی، اور وہ قَسمیں بھی ہو سکتی ہیں جو عبداللہ بن اُبَیّ نے حضرت زیدؓ بن اَرقَم کی دی ہوئی خبر کو جھٹلانے کے لیے کھائی تھیں۔ اِن سب احتمالات کے ساتھ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اِس قول کو قسم قرار دیا ہو کہ ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔'' اس آخری احتمال کی بنا پر فقہا کے درمیان یہ بحث پیدا ہوئی ہے کہ کوئی شخص ''مَیں شہادت دیتا ہوں'' کے الفاظ کہہ کر کوئی بات بیان کرے تو آیا اسے قَسم یا حلف (oath) قرار دیا جائے گا یا نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب (امام زُفَرؒ کے سوا) اور امام سُفیان ثَوریؒ اور امام اَوزاعیؒ اسے حلف (شرعی اصطلاح میں یمین) قرار دیتے ہیں۔ امام زُفَرؒ کہتے ہیں کہ یہ حلف نہیں ہے۔ امام مالک سے دو قول مروی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مطلقاً حلف ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ اگر اس نے ''شہادت دیتا ہوں'' کے الفاظ کہتے وقت نیّت یہ کی ہو کہ ''خدا کی قسم میں شہادت دیتا ہوں''، یا ''خدا کو گواہ کر کے میں شہادت دیتا ہوں'' تو اس صورت میں یہ حلفیہ بیان ہوگا ورنہ نہیں۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ اگر کہنے والا یہ الفاظ بھی کہے کہ میں ''خدا کو گواہ کر کے شہادت دیتا ہوں'' تب بھی اس کا یہ بیان حلفیہ بیان نہ ہوگا، اِلّا یہ کہ یہ الفاظ اس نے حلف اُٹھانے کی نیّت سے کہے ہوں۔ (احکام القرآن للجَصّاص، احکام القرآن لابن العَرَبی)

۳- صَدّ کا لفظ عربی زبان میں لازم بھی ہے اور متعدّی بھی۔ اس لیے صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے معنٰی یہ

QuranUrdu.com

بھی ہیں کہ وہ اللہ کے راستے سے خود رُکتے ہیں، اور یہ بھی کہ وہ اس راستے سے دوسروں کو روکتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے ترجمے میں دونوں معنیٰ درج کر دیے ہیں۔ پہلے معنیٰ کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اپنی اِن قسموں کے ذریعے سے مسلمانوں کے اندر اپنی جگہ محفوظ کر لینے کے بعد وہ اپنے لیے ایمان کے تقاضے پُورے نہ کرنے اور خدا و رسُولؐ کی اطاعت سے پہلُوتہی کرنے کی آسانیاں پیدا کر لیتے ہیں۔ دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اپنی اِن جھوٹی قسموں کی آڑ میں وہ شکار کھیلتے ہیں، مسلمان بن کر مسلمانوں کی جماعت میں اندر سے رخنے ڈالتے ہیں، مسلمانوں کے اَسرار سے واقف ہو کر دشمنوں کو اُن کی خبریں پہنچاتے ہیں، اسلام سے غیر مسلموں کو بدگمان کرنے اور سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں میں شبہات اور وسوسے ڈالنے کے لیے وہ وہ حَربے استعمال کرتے ہیں جو صرف ایک مسلمان بنا ہوا منافق ہی استعمال کر سکتا ہے، کھلا کھلا دشمنِ اسلام اُن سے کام نہیں لے سکتا۔

۴ – اس آیت میں ایمان لانے سے مراد ایمان کا اقرار کر کے مسلمانوں میں شامل ہونا ہے۔ اور کفر کرنے سے مراد دل سے ایمان نہ لانا اور اُسی کفر پر قائم رہنا ہے جس پر وہ اپنے ظاہری اقرارِ ایمان سے پہلے قائم تھے۔ کلام کا مدّعا یہ ہے کہ جب انھوں نے خوب سوچ سمجھ کر سیدھے سیدھے ایمان یا صاف صاف کفر کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے یہ منافقانہ رَوِش اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی گئی اور ان سے یہ توفیق سلب کر لی گئی کہ وہ ایک سچّے اور بے لاگ اور شریف انسان کا سا رَوِیّہ اختیار کریں۔ اب ان کی سمجھ بُوجھ کی صلاحیّت مفقود ہو چکی ہے۔ ان کی اَخلاقی حِس مر چکی ہے۔ انھیں اس راہ پر چلتے ہوئے کبھی یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ شب و روز کا جھوٹ اور یہ ہر وقت کا مکر و فریب اور یہ قول و فعل کا دائمی تضاد، کیسی ذلیل حالت ہے جس میں انھوں نے اپنے آپ کو مبتلا کر لیا ہے۔

یہ آیت من جملہ اُن آیات کے ہے جن میں اللہ کی طرف سے کسی کے دل پر مُہر لگانے کا مطلب بالکل واضح طریقے سے بیان کر دیا گیا ہے۔ ان منافقین کی یہ حالت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی تھی اس لیے ایمان ان کے اندر اُتر ہی نہ سکا اور وہ مجبوراً منافق بن کر رہ گئے۔ بلکہ اس نے ان کے دلوں پر یہ مُہر اس وقت لگائی جب انھوں نے اظہارِ ایمان کرنے کے باوجود کفر پر قائم رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ تب ان سے مخلصانہ ایمان اور اس سے پیدا ہونے والے اَخلاقی رویّے کی توفیق سلب کر لی گئی، اور اُس منافقت اور منافقانہ اَخلاق ہی کی توفیق انھیں دے دی گئی جسے انھوں نے خود اپنے لیے پسند کیا تھا۔

۵ – حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن اُبَیّ بڑے ڈیل ڈَول کا، تندرست، خوش شکل اور چرب زبان آدمی تھا۔ اور یہی شان اس کے بہت سے ساتھیوں کی تھی۔ یہ سب مدینے کے رئیس لوگ تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے تو دیواروں سے تکیے لگا کر بیٹھتے اور بڑی لچھے دار باتیں کرتے۔ ان کے جُثّۂ بُشرے کو دیکھ کر اور ان کی باتیں سُن کر کوئی یہ گمان تک نہ کر سکتا تھا کہ بستی کے یہ معزّزین اپنے کردار کے لحاظ سے اتنے ذلیل ہوں گے۔

٦ – یعنی یہ جو دیواروں کے ساتھ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں، یہ انسان نہیں ہیں بلکہ لکڑی کے کُندے ہیں۔ اُن کو لکڑی

QuranUrdu.com

يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ
اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۴ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ
اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝۵

ہر زور کی آواز کو یہ اپنے خلاف سمجھتے ہیں[۷]۔ یہ پکّے دشمن ہیں[۸]، ان سے بچ کر رہو[۹]، اللہ کی مار ان پر[۱۰]! یہ کدھر اُلٹے پھرائے جا رہے ہیں[۱۱]۔

اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تاکہ اللہ کا رسولؐ تمھارے لیے مغفرت کی دُعا کرے، تو سر جھٹکتے ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ آنے سے رُکتے ہیں[۱۲]۔

سے تشبیہ دے کر یہ بتایا گیا کہ یہ اَخلاق کی رُوح سے خالی ہیں جو اصل جوہرِ انسانیت ہے۔ پھر انھیں دیوار سے لگے ہوئے کُندوں سے تشبیہ دے کر یہ بھی بتا دیا گیا کہ یہ بالکل ناکارہ ہیں۔ کیونکہ لکڑی بھی اگر کوئی فائدہ دیتی ہے تو اُس وقت جب کہ وہ کسی چھت میں، یا کسی دروازے میں، یا کسی فرنیچر میں لگ کر استعمال ہو رہی ہو۔ دیوار سے لگا کر کُندے کی شکل میں جو لکڑی رکھ دی گئی ہو وہ کوئی فائدہ بھی نہیں دیتی۔

۷- اس مختصر سے فقرے میں ان کے مجرم ضمیر کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ چونکہ وہ اپنے دلوں میں خوب جانتے تھے کہ وہ ایمان کے ظاہری پردے کی آڑ میں منافقت کا کیا کھیل کھیل رہے ہیں، اس لیے انھیں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کب ان کے جرائم کا راز فاش ہو، یا ان کی حرکتوں پر اہلِ ایمان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور ان کی خبر لے ڈالی جائے۔ بستی میں کسی طرف سے بھی کوئی زور کی آواز آتی یا کہیں کوئی شور بلند ہوتا تھا تو وہ سہم جاتے اور یہ خیال کرتے تھے کہ آ گئی ہماری شامت۔

۸- دوسرے الفاظ میں کھلے دشمنوں کی بہ نسبت یہ چھپے ہوئے دشمن زیادہ خطرناک ہیں۔

۹- یعنی ان کے ظاہر سے دھوکا نہ کھاؤ۔ ہر وقت خیال رکھو کہ یہ کسی وقت بھی دغا دے سکتے ہیں۔

۱۰- یہ بددعا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے بارے میں اِس فیصلے کا اعلان ہے کہ وہ اس کی مار کے مستحق ہو چکے ہیں، ان پر اس کی مار پڑ کر رہے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے لُغوی معنیٰ میں استعمال نہ فرمائے ہوں بلکہ عربی محاورے کے مطابق لعنت اور پھٹکار اور مَذَمَّت کے لیے استعمال کیے ہوں، جیسے اُردو میں ہم کسی کی بُرائی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ستیاناس اُس کا، کیسا خبیث آدمی ہے۔ اس لفظ ''ستّیاناس'' سے مقصود اس کی خباثت کی شدّت ظاہر کرنا ہوتا ہے نہ کہ اس کے حق میں بددعا کرنا۔

QuranUrdu.com

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝٦

اے نبیؐ! تم چاہے ان کے لیے مغفرت کی دُعا کرو یا نہ کرو، ان کے لیے یکساں ہے، اللہ ہرگز انھیں معاف نہ کرے گا[۱۳]، اللہ فاسق لوگوں کو ہرگز ہدایت نہیں دیتا[۱۴]۔

۱۱- یہ نہیں بتایا گیا کہ ان کو ایمان سے نِفاق کی طرف اُلٹا پھرانے والا کون ہے۔ اس کی تصریح نہ کرنے سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ اُن کی اِس اَوندھی چال کا کوئی ایک محرّک نہیں ہے بلکہ بہت سے محرّکات اس میں کارفرما ہیں۔ شیطان ہے۔ بُرے دوست ہیں۔ ان کے اپنے نفس کی اغراض ہیں۔ کسی کی بیوی اس کی محرِّک ہے۔ کسی کے بچے اس کے محرّک ہیں۔ کسی کی برادری کے اَشرار اس کے محرّک ہیں۔ کسی کو حسد اور بُغض اور تکبُّر نے اس راہ پر ہانک دیا ہے۔

۱۲- یعنی صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ رسولؐ کے پاس اِستِغفار کے لیے نہ آئیں، بلکہ یہ بات سُن کر غرور اور تمکِنَت کے ساتھ سر کو جھٹکا دیتے ہیں اور رسولؐ کے پاس آنے اور معافی طلب کرنے کو اپنی توہین سمجھ کر اپنی جگہ جمے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ ان کے مومن نہ ہونے کی کُھلی علامت ہے۔

۱۳- یہ بات سورۂ توبہ میں (جو سورۂ منافقون کے تین سال بعد نازل ہوئی ہے) اور زیادہ تاکید کے ساتھ فرما دی گئی۔ اُس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطَب کر کے منافقین کے متعلق فرمایا کہ ”تم چاہے ان کے لیے اِستِغفار کرو یا نہ کرو، اگر تم ستّر مرتبہ بھی ان کے لیے دُعائے مغفرت کرو گے تو اللہ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا۔ یہ اس لیے کہ اِنھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے کفر کیا ہے، اور اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔“ (التوبہ: ۸۰) آگے چل کر پھر فرمایا: ”اگر ان میں سے کوئی مر جائے تو اس کی نماز جنازہ کبھی نہ پڑھنا اور نہ اُس کی قبر پر کھڑے ہونا۔ اِن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے کفر کیا ہے اور یہ فاسق ہونے کی حالت میں مرے ہیں۔“ (التوبہ: ۸۴)

۱۴- اس آیت میں دو مضمون بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ دعائے مغفرت صرف ہدایت یافتہ لوگوں ہی کے حق میں مفید ہو سکتی ہے۔ جو شخص ہدایت سے پھر گیا ہو اور جس نے اطاعت کے بجائے فِسق و نافرمانی کی راہ اختیار کر لی ہو، اس کے لیے کوئی عام آدمی تو درکنار، خود اللہ کا رسول بھی مغفرت کی دُعا کرے تو اسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ ایسے لوگوں کو ہدایت بخشنا اللہ کا طریقہ نہیں ہے جو اس کی ہدایت کے طالب نہ ہوں۔ اگر ایک بندہ خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے منہ موڑ رہا ہو، بلکہ ہدایت کی طرف اسے بلایا جائے تو سر جھٹک کر غرور کے ساتھ اس دعوت کو ردّ کر دے، تو اللہ کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اس کے پیچھے پیچھے اپنی ہدایت لیے پھرے اور خوشامد کر کے اسے راہِ راست پر لائے۔

QuranUrdu.com

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى
يَنْفَضُّوْا ؕ وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنَّ
الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝٧ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ
لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ
لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝٨ ع يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ

یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسولؐ کے ساتھیوں پر خرچ کرنا بند کر دو تاکہ یہ منتشر ہو جائیں۔ حالانکہ زمین اور آسمانوں کے خزانوں کا مالک اللہ ہی ہے، مگر یہ منافق سمجھتے نہیں ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم مدینے واپس پہنچ جائیں تو جو عزّت والا ہے وہ ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے[15] گا۔ حالانکہ عزّت تو اللہ اور اس کے رسولؐ اور مومنین کے لیے ہے[16]، مگر یہ منافق جانتے نہیں ہیں۔ ع

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھارے مال اور تمھاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں[17]۔[18]

---

۱۵ – حضرت زیدؓ بن اَرقَم کہتے ہیں کہ جب میں نے عبداللہ بن اُبَیّ کا یہ قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا، اور اس نے آ کر صاف انکار کر دیا اور اس پر قسم کھا گیا، تو انصار کے بڑے بوڑھوں نے اور خود میرے اپنے چچا نے مجھے بہت ملامت کی، حتّٰی کہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ حضورؐ نے بھی مجھے جھوٹا اور عبداللہ بن اُبَیّ کو سچا سمجھا ہے۔ اس چیز سے مجھے ایسا غم لاحق ہوا جو عمر بھر کبھی نہیں ہوا اور میں دل گرفتہ ہو کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ پھر جب یہ آیات نازل ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا کر ہنستے ہوئے میرا کان پکڑا اور فرمایا: ''لڑکے کا کان سچّا تھا، اللہ نے اِس کی خود تصدیق فرما دی۔'' (ابنِ جَریر، تِرمِذِی میں بھی اس سے ملتی جُلتی روایت موجود ہے)۔

۱۶ – یعنی عزت اللہ کے لیے بالذات مخصوص ہے، اور رسولؐ کے لیے بربِنائے رسالت، اور مومنین کے لیے بربنائے ایمان۔ رہے کُفّار و فُسّاق و منافقین، تو حقیقی عزّت میں سرے سے ان کا کوئی حصّہ ہی نہیں ہے۔

۱۷ – اب تمام اُن لوگوں کو جو دائرۂ اسلام میں داخل ہوں، قطعِ نظر اس سے کہ سچّے مومن ہوں یا محض زبانی اقرارِ ایمان کرنے والے، عام خطاب کر کے ایک کلمۂ نصیحت ارشاد فرمایا جا رہا ہے۔ یہ بات اس سے پہلے ہم کئی

QuranUrdu.com

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۹ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا
رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ
لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ
الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۰ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ
خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۱ ع

جو لوگ ایسا کریں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔ جو رزق ہم نے تمھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور اُس وقت وہ کہے کہ ”اے میرے رب! کیوں نہ تُو نے مجھے تھوڑی سی مُہلت اَور دے دی کہ مَیں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا۔“ حالانکہ جب کسی کی مُہلتِ عمل پُوری ہونے کا وقت آ جاتا ہے تو اللہ اُس کو ہرگز مزید مُہلت نہیں دیتا، اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔ ع

مرتبہ بیان کر چکے ہیں کہ قرآنِ مجید میں اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ سے کبھی تو سچّے اہلِ ایمان کو خطاب کیا جاتا ہے، اور کبھی اس کے مخاطَب منافقین ہوتے ہیں، کیونکہ وہ زبانی اقرارِ ایمان کرنے والے ہوا کرتے ہیں، اور کبھی ہر طرح کے مسلمان بالعُموم اس سے مراد ہوتے ہیں۔ کلام کا موقع و محل یہ بتا دیتا ہے کہ کہاں کون سا گروہ ان الفاظ کا مخاطب ہے۔

۱۸- مال اور اولاد کا ذکر تو خاص طور پر اس لیے کیا گیا ہے کہ انسان زیادہ تر انھی کے مفاد کی خاطر ایمان کے تقاضوں سے منہ موڑ کر منافقت، یا ضعفِ ایمان، یا فِسق و نافرمانی میں مبتلا ہوتا ہے، ورنہ درحقیقت مراد دُنیا کی ہر وہ چیز ہے جو انسان کو اپنے اندر اِتنا مشغول کر لے کہ وہ خدا کی یاد سے غافل ہو جائے۔ یہ یادِ خدا سے غفلت ہی ساری خرابیوں کی اصل جڑ ہے۔ اگر انسان کو یہ یاد رہے کہ وہ آزاد نہیں ہے بلکہ ایک خدا کا بندہ ہے، اور وہ خدا اس کے تمام اعمال سے باخبر ہے، اور اس کے سامنے جا کر ایک دن اسے اپنے اعمال کی جواب دِہی کرنی ہے، تو وہ کبھی کسی گمراہی و بدعملی میں مبتلا نہ ہو، اور بَشَری کمزوری سے اس کا قدم اگر کسی وقت پھسل بھی جائے تو ہوش آتے ہی وہ فوراً سنبھل جائے۔